© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

نظریۂ توحید

اور

اس کی اساس

توحید انسانی قلب وضمیر کی صدائے بازگشت ہے یا بُت پرستی کی تجرید

اللہ تعالیٰ کو فہم وادراک کے دائرے میں لانے کے لیے دو روایتیں قائم ہوئیں۔ دینی روایت اور سائنسی روایت۔ سائنسی روایت نے اس مسئلہ کو کچھ اس انداز سے پیش کیا۔ کہ انسان نے جب شعور وادراک کی آنکھ کھولی۔ اور اس حقیقت کا کھوج لگانا چاہا۔ کہ اس وسیع تر پھیلی ہوئی کائنات میں کن قوتوں کی کارفرمائی ہے تو اس نے چاند، سورج کی چمک دمک سے متاثر ہو کر یہ سمجھ لیا کہ ہو نہ ہو، یہی دو قوتیں اس دنیا کے مقدر پر اثر انداز ہونے والی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ دوسرے نجوم وکواکب بھی اس عظمت میں ان کے شریک ہو گئے۔ اس کے بعد مرورِ زمانہ سے ان کے مندر بنے، ہیکل تعمیر ہوئے۔ اور پروہتوں اور پجاریوں کی کوششوں سے ان کے نائب اصنام کی شکل میں تراشے گئے۔ اور اس طرح ہزاروں برس دنیا میں بت پرستانہ تہذیب کا دور دورہ رہا۔ اس کے بعد کچھ ذہین اور حساس افراد نے بُت پرستی میں انسانی تذلیل محسوس کی۔ اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ کائنات کے بنانے اور بگاڑنے میں ان تراشیدہ بتوں کا کوئی حصہ نہیں۔ اس بزم کو آراستہ کرنے والی کوئی ایک جلیل القدر ہستی ہے۔ اسی کو پوجنا چاہیے اور اسی کی عظمت وبرتری کے گن گانے چاہئیں۔ اس اندازِ فکر کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے متعلق عقیدے اور اس کے بارے میں توحید کا جانا بوجھا تصور کسی معروضی حقیقت پر مبنی نہیں۔ بلکہ یہ محض فکری ارتقا کا نتیجہ اور تجرید ہے یعنی انسان جب تک مظاہر پرستی اور بُت پرستی کے دور سے نہیں گزرا۔ اس وقت تک اس کا ذہن توحید کی جانب منتقل ہی نہیں ہو پایا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ سائنسی روایت جسے فلسفیانہ روایت کہنا زیادہ موزوں تعبیر ہے بہت قدیم ہے۔ ابیقوری حکما یہی کہتے تھے۔ اللہ اور اس کی صفات کا تصور موضوعی ہے معروضی اور حقیقی نہیں۔ اسی کو کومٹے، فیورباخ اور فرائڈ کے مختلف فلسفوں نے کمال تک پہنچایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیسویں صدی کا تھکا ہارا انسان اللہ تعالیٰ اور اس کی توحید کو محض ڈھکوسلا سمجھ بیٹھا۔ دینی روایت نے اس کے برعکس اس مسئلہ کو قلب و اذعان کا مسئلہ ٹھہرایا ہے۔ جو شک و شبہ کی ہر کھٹک سے بالاتر ہے۔

أَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (ابراہیم: ۱۰)

کیا (تم کو) خدا (کے بارے) میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

یہ ایسا مسئلہ ہے جو دل کی گہرائیوں میں ثبت ہے۔

وَفِي اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔ (الذاریات: ۲۱)

اور خود تمہارے نفوس میں تو کیا تم دیکھتے نہیں؟

یہی نہیں اس روایت کی رُو سے خود کائنات کا ذرہ ذرہ، اس کے وجود، اس کی تجلیات اور انوار پر شاہدِ عدل کی حیثیت رکھتا ہے۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ
وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ
النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ
مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ
بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ
الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ
السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ
(بقرہ: ۱۶۴)

اور لوگو تمہارا معبود خدائے واحد ہے اس بڑے مہربان (اور) رحم والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں اور کشتیوں (اور جہازوں) میں جو دریا میں لوگوں کے فائدے کے لیے رواں ہیں اور مینہ میں جس کو خدا آسمان سے برساتا اور اس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ (یعنی خشک ہوئے پیچھے سرسبز) کر دیتا ہے اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں عقلمندوں کے لیے (خدا کی قدرت کی) نشانیاں ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ تعالیٰ اور اس کی توحید کے بارہ میں اس مقدس روایت کو قائم کرنے والے وہ لاکھوں پیغمبر، حکما اور عارف ہیں۔ جنھوں نے اللہ تعالیٰ سے براہِ راست یہ روشنی پائی۔ جنھوں نے اپنے وجدان وضمیر کی سطح پر ان نقوش کا مطالعہ کیا اور کائنات کے نظم و نسق اور حسن و دل آویزی میں اس کے جمالِ جہانتاب کی جھلک پائی۔

ووصّٰی بھا ابراھیم بنیہ ویعقوب یٰبنی ان اللہ اصطفٰی لکم الدین فلا تموتن الا وانتم مسلمون ۰ ام کنتم شھداء اذ حضر یعقوب الموت اذ قال لبنیہ ما تعبدون من بعدی ط قالوا نعبد الٰھک و الٰہ اٰبآئک ابراھیم واسمٰعیل و اسحٰق الٰھاً واحداً ونحن لہ مسلمون۔

(بقرہ : ۱۳۲)

اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اس بات کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی (اپنے فرزندوں سے یہی کہا) کہ بیٹا خدا نے تمہارے لیے یہی دین پسند فرمایا ہے تو مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔ بھلا جس وقت یعقوب وفات پانے لگے تو تم اس وقت موجود تھے۔ جب انھوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے تو انھوں نے کہا کہ آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے اور ہم اسی کے حکمبردار ہیں۔

اس روایت سے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی زندگی میں انقلاب آیا۔ اس سے محدود اور کمزور انسانوں کا قوی اور برتر خدا سے رشتہ استوار ہوا۔ کردار و سیرت کے گوشے چمکے۔ سرِشت انسانی کے جوہر کھلے اور عظمتِ انسانی نے تہذیب وتمدن کے ایسے حسین نقوش کو جنم دیا کہ چشمِ فلک اس کی مثال دیکھنے سے قاصر رہی ہے۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عقیدہ اور توحید کا نتھرا ہوا تصور ابتدا سے ہے، اس میں ارتقا تو کیا اُلٹے تنزل ہوا اور شرک اسی تنزل کی یادگار ہے۔ انبیا علیہم السلام نے اوّل روز سے واحدانیت ہی کی تلقین کی اور ہر ہر دَور میں اسی کے رُخ و رخسار کو تابانیاں بخشیں۔ اس روایت کا تعلق جہاں ایک طرف انسان کے ضمیر و وجدان کے عرفان سے ہے وہاں دراصل اس کا تعلق آسمان اور اس کی فیض رسانیوں سے ہے اور سائنسی اور فلسفیانہ روایت زمین کی پیداوار ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں فرق نمایاں ہونا چاہیے۔ زمین کتنی بھی بلند ہو آسمان کی بلندیوں کو نہیں پہنچ پاتی۔ ہاں آسمان چاہے تو اپنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فیض رسانیوں سے زمین کی پستیوں کو رفعت عطا کر دے، اور اس کی تاریکیوں کو اُجالوں سے بدل دے۔ یسعیاہ نبی کے اس عارفانہ قول میں کس درجہ صداقت جھلک رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"میرے افکار تمھارے افکار نہیں ہوسکتے، نہ میری راہیں تمھاری راہیں ہوسکتی ہیں اس لیے کہ آسمان زمین سے کہیں بلند اور ارفع ہے۔ سو میری راہیں تمھاری راہوں سے اعلیٰ اور بلند ہیں۔ اور میرے افکار تمھارے افکار سے بلند تر اور اونچے ہیں۔"[1]

ہم اس حقیقت کو بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تصوّر کو فلسفہ و فکر کی ترکتازیوں نے پیش نہیں کیا۔ بلکہ یہ وہ مئے عرفان ہے جس کو وحی کے خم و پیمانہ نے چھلکایا ہے۔ فلسفہ کی درماندگی اس لائق ہی کب ہے کہ اتنی بڑی حقیقت کو دریافت کر سکے۔ انسانی ذہن بہرحال محدود ہے اور زمان و مکان کی جکڑبندیوں سے آگے نکل جانے کی استطاعت سے یکسر محروم۔ لہٰذا اس کا سرمایہ کاوش کسی بھی مابعد الطبیعی انکشاف کا حامل نہیں ہوسکتا۔ اس حقیقت کو ایک مشہور مغربی حکیم نے کتنے اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے:

"یہ فلسفہ کا کام نہیں کہ دین کی حقیقتوں کو اُجاگر کرے اور کسی شخص کے دل کو اس کے اُجالوں سے بہرہ مند کرے۔ کیونکہ دین کے گہرے نقوش پہلے سے ہر ہر دل پر مرتسم ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جہاں تک انسانی فطرت کا تعلق ہے فلسفہ اس بارے میں کبھی بھی نئی حقیقت کا اظہار نہیں کر سکتا۔ انسان کے مادّی اور سمٹے ہوئے ذہن سے دین کی طرفہ طرازیوں کی توقع رکھنا اتنا لغو اور بعید از قیاس ہے جتنا کوئی شخص کتاب کا کوئی صفحہ کُتّے کے آگے کھول دے اور امید رکھے کہ یہ اس کے مشتملات کو سمجھ لے گا۔"

غرض ظاہر ہے جب تک کوئی شخص اپنی روحانی دلچسپیوں کو وسیع تر نہیں کرتا اور محدود دنیا کے ہنگاموں سے آگے نکل کر معرفت کی وادی پُرخار میں قدم نہیں رکھتا، اس میں حصہ دار نہیں بنتا، باقاعدہ شریک نہیں ہوتا۔ اور روح کی لطافتوں کو اپنا منتہائے نظر نہیں ٹھہراتا۔ ناممکن

---

[1] یسعیاہ: ۵۵ : ۸، ۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ بھی تسلیم کرتی اور جا لیتا ہے مراد و احد ذات مضمر رہ جاتی ہے

ہے کہ وہ زندگی کو کوئی بلندی عطا کرسکے اور اس کو بامعنی بناسکے، یا اپنے قلب و ذہن میں اس لطیف عنصر کو پاسکے۔ جو اس وقت زیرِ بحث ہے [۱]

علاوہ ازیں توحید کو بُت پرستی کی ارتقائی صورت قرار دینے میں یہ گھپلا ہے کہ اس طرح انسان کے بارہ میں ہمیں رائے قائم کرنا پڑے گی کہ یہ ہمیشہ پہلے غلط سوچتا ہے، اور پھر جب غلطی واضح ہوجاتی ہے تو بدرجہ مجبوری صحیح رائے اختیار کرتا ہے۔ ہم قدیم انسان سے متعلق اس سوئے ظن کے ہرگز قائل نہیں۔ بلکہ ہم تو اس سے آگے بڑھ کر یہ کہیں گے کہ قدمائے آج سے ہزاروں برس پہلے اس حقیقت کو پالینے میں کامیابی حاصل کرلی تھی کہ اس کائنات کا مزاج محض مادّی نہیں۔ اور یہ کہ یہ کارخانہ صرف قوت اور کسی مادّی محرک کے بل پر نہیں چل رہا ہے۔ بلکہ اس کے پیچھے روحانی عوامل کارفرما ہیں۔ بصیرت و ادراک کی اس نعمت سے ہمارا یہ سائنسی دَور کس درجہ محروم ہے۔ اس کا اندازہ آپ خود لگائیے۔ اس سے قطع نظر توحید اسی طرح کی ایک جانی بوجھی حقیقت ہے۔ جس طرح مثلاً یہ احساس کہ فلاں کام بُرا ہے، فلاں کام اچھا ہے، فلاں شئی حسین ہے اور فلاں قبیح ہے۔

ظاہر ہے کہ اخلاقیات و جمالیات کی ان قدروں میں کوئی ارتقا رونما نہیں ہوا، بلکہ جب سے انسان نے سمجھ بوجھ کی نعمت پائی ہے اس وقت سے حسن و قبح، اور خیر و شر میں جو حدود امتیاز پائے جاتے ہیں ان کو اچھی طرح جانتا اور پہچانتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جب سے انسان نے معرفت کی آنکھ کھولی ہے، جب سے اس نے کائنات پر غور و فکر کرنے کی عادت ڈالی ہے۔ اس وقت سے یہ اس احساس سے برابر بہرہ مند رہا ہے کہ اس کائنات کو کسی علیم و حکیم ہستی نے پیدا کیا ہے۔ اور پھر اس احساس کو ان لاکھوں اللہ کے بندوں نے ہر ہر دَور میں زندہ و تابندہ رکھا ہے۔ جنھوں نے نہ صرف توحید کے اجالوں کو عام کیا ہے بلکہ اس کو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں برت کر بھی دکھایا ہے۔

توحید کا اثر فکر و عمل پر

توحید کی بحث تشنۂ تکمیل رہے گی۔ اگر ہم یہ نہ بتا پائیں کہ فکر و عمل پر اس کے کیا اثرات

---

[۱] فلاسفی آف ریلیجن انگلش بروشر جلد اول ص ۱۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مترتب ہوتے ہیں۔ اس بارہ میں پہلے ہی قدم پر اس حقیقت کو جان لینا ضروری ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے، عقیدہ نہ خشک منطقی اذعان کا نام ہے۔ اور نہ اسے کسی بھی صورت میں محض تحکم ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک فعال اور حد درجہ انقلابی عنصر ہے جس کو مان لینے کے بعد عمل و سیرت کا نقشہ بالکل بدل جاتا ہے۔ یہ ایک قوت کا نام ہے ایک محرک اور زندہ عامل سے تعبیر ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ آپ جس طرح کے عقائد کو اپنے فکر و ذہن کا جزو بنائیں گے۔ آپ کی زندگی اسی انداز کی غماز ہوگی۔ کیونکہ عقیدہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ آپ نے، اپنے لیے پسند اور ناپسند کے کچھ پیمانے مقرر کر لیے ہیں۔ اور زندگی سے متعلق کسی واضح تصور کو حرزِ جان بنا لیا ہے۔ اس صورت میں ضروری ہے کہ تسلیم و رضا کا یہ اسلوب آپ کی زندگی آپ کی سیرت اور روزمرہ کے معمولات کو ایک خاص روپ عطا کرے اور اگر یہ عقیدہ، اس کے برعکس محض ذہن کی چاردیواری میں محصور ہو کر رہ جاتا ہے اور زندگی کی مشکلات میں آپ کے لیے سپر ثابت نہیں ہوتا۔ تو اس کو عقیدہ و ایمان نہیں کہہ سکتے۔ یہ ایک خیال ہے ہو سکتا ہے اس کو ذہنی عیاشی کہہ سکتے ہیں یا کسی اور نام سے اس کو پکارا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ اس لائق ہرگز نہیں کہ عقیدہ و ایمان کی جگہ لے سکے۔

اس مرحلہ پر حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس مسلک سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ ایمان میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔ حضرت الامام دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب ایک شخص اللہ تعالیٰ کی توحید اور آنحضرت کی رسالت کو مان لیتا ہے، تو اس کا صرف مان لینا، اتنا ہی مستحسن اور اسلامی معاشرہ میں اتنا ہی قابلِ لحاظ ہے جتنا کہ کسی ولی اللہ یا بڑے سے بڑے صحابیٔ رسولؐ کا مان لینا کیونکہ نفسِ ایمان میں دونوں برابر اور یکساں ہیں۔ جن لوگوں کو اسلامی فقہ و تفسیر سے شغف ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ ایمان کی کمی بیشی کا مسئلہ ہمارے ہاں صدیوں اختلاف و نزاع رہا ہے اور محدثین اور فقہا احناف میں دوران بحث میں اچھی خاصی لے دے ہوئی ہے اور تو اور اس سلسلہ میں کچھ حضرات نے تو حضرت الامام کو تہمت ارجاء سے متہم کر دینے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کیا۔ ان لوگوں کی ذہنی مجبوری درحقیقت یہ تھی کہ چونکہ قرآن حکیم میں بار بار اس نوع کی آیات پڑھتے تھے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فمنھم من یقول ایکم زادتہ ھٰذہ ایمانا۔ (توبہ: ۱۲۴)

تو بعض منافق (استہزا کرتے اور) پوچھتے ہیں کہ اس سورۃ نے تم میں سے کس کا ایمان زیادہ کیا ہے۔

واذا تلیت علیھم ایاتہ زادتھم ایمانا۔ (انفال: ۲)

اور جب انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔

ویزید اللہ الذین اھتدوا ھدی۔ (مریم: ۷۶)

جو لوگ ہدایت یاب ہیں خدا اُن کو زیادہ ہدایت دیتا ہے۔

والذین اھتدوا زادھم ھدی واتاھم تقواھم۔ (محمدؐ: ۱۷)

اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں اُن کو وہ ہدایت مزید بخشتا ہے اور پرہیزگاری عنایت کرتا ہے۔

اور بجا طور پر ان سے یہ نتیجہ اخذ کرتے تھے کہ ایمان و ہدایت کسی جامد یا ساکن و راکد حقیقت کا نام نہیں۔ بلکہ بعض داخلی و خارجی اسباب سے ان میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ہماری رائے میں اگر اس حقیقت پر غور کر لیا جائے تو شبہات کے دل بادل چھٹ جاتے ہیں۔ حضرت الامام کا منصب ایک ژرف نگاہ فقیہ کا منصب ہے۔ لہٰذا وہ ایمان کے صرف اس پہلو سے بحث کرتے ہیں جس کا تعلق معاشرہ کی اسلامی ذمہ داریوں سے ہے۔ اور محض یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب ایک شخص اسلام کو قبول کر لیتا ہے، تو یہ قبول کر لینا چاہے کسی درجہ کا ہو اس سے یہ اس بات کا ذمہ دار ہو جاتا ہے کہ اسلام کے اوامر و نواہی کو تسلیم کرے اور معاشرہ کے سامنے اپنے کو جواب دہ تصور کرے۔ دوسرے لفظوں میں حضرات احناف ایمان کے فقہی پہلو سے تعرض کرتے ہیں اس کے نفسیاتی پہلوؤں سے نہیں۔ اور ہم جب عقیدہ و ایمان کو پوری زندگی پر اثر انداز قرار دیتے ہیں۔ تو ہمارے سامنے اس کے نفسیاتی پہلو ہوتے ہیں۔ اور انھیں نفسیاتی پہلوؤں پر قرآن حکیم کی محولہ آیات کا اطلاق ہوتا ہے۔

توحید کے ذہن و قلب یا کردار و سیرت پر کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں، اس کی تفصیلات میں جانے سے پہلے اس استثنا کو ملحوظ رکھنا ہو گا کہ اس میں وہ کیفیات داخل نہیں جن کا تعلق یکسر ہمارے داخل و باطن سے ہے یعنی اس سے کہ انسان کن لذتوں کو دامن دل میں سمیٹتا ہے۔ کن معارف و تجلیات کا ہدف بنتا ہے۔ کن لطائف کی بیداری سے بہرہ مند ہوتا ہے اور کن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انوار و تائیداتِ غیبی سے شب و روز دوچار ہوتا ہے۔ یا ایک موحد اللہ اور صرف اللہ پر بھروسہ رکھنے والا انسان کس درجہ سرور و اطمینان کی دولت سے مالامال ہے۔

یہ وہ امور ہیں جن کو کسی خارجی حوالہ سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان سے کچھ وہی پاکیزہ نفوس آشنا ہیں جو ان سے براہِ راست دوچار ہیں۔ توحید کو مجاہدہ و ریاضت کی اولیں اساس قرار دیتے ہیں۔ اور سیر الی اللہ کے مرحلہ میں اسی کو اپنا مبدا و منتہا ٹھہراتے ہیں۔ جو توحید ہی کی صاف ستھری آب و ہوا میں سانس لینے کے عادی ہیں۔ اور توحید ہی کے تغذیہ پر جن کی قوت روحانی کا دارومدار ہے۔

یہ وہ احوال ہیں جن سے اہلِ قال قطعی آگاہ نہیں ہو سکتے۔ ان احوال و کوائف سے آشنائی پیدا کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ تعلق باللہ کو محبت و عشق کی بنیاد پر استوار کیا جائے۔ یعنی اللہ کو اس طرح چاہا جائے کہ اس کی آرزو میں راتیں کٹیں، دن بیتیں۔ ہر رات نالۂ صبح گاہی پر ختم ہو۔ اور ہر صبح نئی آرزوؤں اور تمناؤں کا آفتاب لے کر طلوع ہو۔ خشوع و اخلاص سے محبت کے اس دبستان کی آبیاری کی جائے۔ اور اس راہ میں پیش آمدہ مشکلات کو بخندہ پیشانی برداشت کرنے کی خو ڈالی جائے۔ یاد رہے کہ تعلق باللہ کی یہ نوعیت یک طرفہ نہیں ہوگی۔ بلکہ جانبِ قدس سے بھی محبت کا جواب محبت ہی سے دیا جائے گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ط (حٰم السجدۃ: ۳۰)	جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے۔ پھر وہ (اس پر) قائم رہے۔ اُن پر فرشتے اتریں گے (اور کہیں گے) کہ نہ خوف کرو اور نہ غمناک ہو۔ اور بہشت کی جس کا تم کو وعدہ کیا جاتا ہے خوشی مناؤ۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے دوست تھے اور آخرت میں بھی (تمہارے رفیق ہیں)۔

جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ توحید پر عمل پیرا انسان کھلے بندوں اللہ تعالیٰ کی تائیدات کا مشاہدہ کرے گا۔ اور خوف و حزن کی چیرہ دستیوں سے اپنے کو محفوظ پائے گا۔

توحید کا پہلا اور عظیم ترین اثر انسانی فکر و ذہن پر یہ مرتب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یکتائی سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس میں اپنی یکتائی کا احساس بیدار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور انسان یہ سچ مچ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ بہتر ہی نہیں، عبد بھی ہے اور کائنات میں اس کی حیثیت صرف حیاتیاتی عنصر ہی کی نہیں۔ بلکہ اس سے سوا۔ اور اس سے زیادہ یہ کسی بڑی حقیقت سے تعبیر ہے، ایسی بڑی حقیقت جس کی جڑیں اگرچہ ایک طرف زمین میں گڑی ہیں۔ تو دوسری طرف اس کے امکاناتِ ارتقاء کی شاخیں آسمان کی پاکیزہ اور مقدس فضا کو چھو رہی ہیں۔ اور احساس عبدیت کا یہی وہ مقام ہے جہاں اس کے اخلاقیات کی سرحدیں۔ ایک ایسے انسان سے جدا ہوتی ہیں جس کا اللہ تعالیٰ سے کوئی رابطہ نہیں۔ جو صرف بشر ہے، صرف حیوان ہے اور عبدیت کی سطح پر فائز نہیں ہو پایا۔

بات یہ ہے کہ اگر یہ انسان اپنی عظیم علمی فتوحات کے باوجود صرف حیاتیاتی ارتقا کی آخری کڑی ہے اور اس نے تعلق باللہ کی رفعتوں کو نہیں اپنایا تو پھر اس کی زندگی کا نقشہ اونچے روحانی درجات سے محروم رہے گا۔ اس صورت میں اس کا منتہائے کمال زیادہ سے زیادہ یہی رہے گا کہ یہ ایسی تہذیب ترتیب دے اور ایسی اقدار ترتیب دے جو اس کی خواہشاتِ نفس کی تکمیل کی ضامن ہوں۔ خواہشات اور جسمانی و نفسانی آرزوؤں کے آگے کے مقامات ارتقا اس کی نظروں سے قطعی اوجھل رہیں گے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ تہذیب انسانی کی معراج بس یہی ہے کہ انسان آزادی سے کھائے پیئے، جنسی جذبوں کی تسکین چاہے، اور بالآخر چپکے سے موت کی آغوش میں جا سوئے۔ ابیقوری حکما جب یہ کہتے ہیں کہ زندگی کا مقصد حصول لذت ہے یا بینتھم جب زندگی کا نصب العین یہ ٹھہراتا ہے کہ انسان اس دنیائے فانی میں جس قدر ہو سکے نفع و فائدہ سے اپنا دامنِ طلب بھر لے۔ تو وہ انسانیت کی اسی تعبیر کو فلسفہ کی اصطلاحوں میں بیان کرتا ہے جس کے مطابق انسان اپنی فطرت مزاج اور خصوصیات کی رو سے تمام تر حیوان ہی ہے دراصل انسانی کے بارہ میں یہی وہ نقطۂ نظر ہے جس نے موجودہ مغربی تہذیب کی بے اعتدالیوں کو جنم دیا ہے۔ انفرادی سطح پر اس سے جو بے راہ روی اور خود غرضی پیدا ہوتی ہے اس کو ہر کوئی جانتا ہے، اسی طرح اجتماعی لحاظ سے یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو استحصال اور ظلم کی شیطانی قوتوں کو ابھار دینے کا باعث بنتا ہے اور کیوں نہ بنے کہ جب لذت سے بہرہ وری ہی گھوم پھر کر زندگی کا نصب العین قرار پایا۔ اور نفع و فائدہ کا حصول ہی انسان کی آخری منزل ٹھہرا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو وہ کون احمق ہے جو عاجل اور خود غرضانہ حسّی لذات سے خواہ مخواہ محرومی اختیار کرے۔ موجودہ تہذیب کا سب سے بڑا المیہ یہی تو ہے کہ ایک طرف علم و ہنر کی تابش و نمو نے انسان کو آسمان تک اُچھال دیا ہے۔ اس کے لیے بے اندازہ سہولتیں اور آسائشیں مہیا کی ہیں۔ اسے صاف ستھرے رہن سہن کا عادی بنایا ہے لیکن دوسری طرف یہ اپنی عادات و اخلاق کے اعتبار سے ہنوز حیوانیت کے عہدِ تاریک سے آگے نہیں بڑھ پایا۔

اس کے برخلاف توحید انسان کو جو احساس عطا کرتی ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے گوشت پوست اور جذبات و احساسات کے اعتبار سے اگرچہ ایک حیوان ہی ہے تاہم اس کی فطرت میں اس کے علاوہ کچھ اور وسعتیں بھی پنہاں ہیں۔ کچھ اور مقدس عناصر ارتقا بھی ہیں۔ اور کچھ اور گوشے اور دریچے بھی ہیں۔ جن کا تعلق عبودیت کی ان غیر محدود پہنائیوں سے ہے۔ جن کی سرحدیں آخر آخر میں رضا حق کی نورانی فضاؤں سے جا ملتی ہیں۔ تصوّر کی بلندی و پستی ہی تو وہ شئی ہے جس کے ذریعے انسان اونچا اُٹھتا اور آسمانوں پر پرواز کرتا ہے یا پھر قعرِ مذلت میں گر پڑتا ہے۔ عقیدۂ توحید انسان کو اسی بلند تر تصوّرِ حیات سے روشناس کراتا ہے۔

غور کیجیے تو فکر کے یہ دونوں انداز اپنے نتائج و ثمرات کے لحاظ سے کس درجہ مختلف ہیں۔ ایک تہذیب اور ایک نظامِ اخلاق سراسر حیوانیت کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے اور دوسرا نقشہ اس اسلوب کا حامل ہے کہ انسان۔ اللہ کا نائب ہے۔ اللہ کا خلیفہ ہے، اور اُسے اس کائنات میں اس جمال جہاں آرا کو پھیلانا ہے۔ اسی خیر و برکت کی تلقین کرنا ہے، اور محبت و عدل کی انہی اقدار مقدر کو فروغ دینا ہے جن کا اکتساب اس نے تعلق باللہ کی بنیاد پر محبوب اور جمیل خدا کی ذات و صفات سے کیا ہے۔ دونوں میں فرق و امتیاز کی حدود اس وقت زیادہ گہری اور واضح ہو جاتی ہیں۔ جب توحید فرد کی اصلاح و تعمیر سے آگے بڑھ کر اجتماعی دائرہ میں ایک جیتی جاگتی تہذیب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیں گے کہ آج سے چودہ سو برس پہلے ایک گروہ نے ثقافت کے اس رُخ کو نہ صرف اپنایا اور اس کے ثمر و نتیجہ سے فائدہ اٹھایا، بلکہ اس مقام کو حاصل کر لینے میں بھی کامیابی حاصل کی، جس کی قرآن نے ان الفاظ میں عکاسی کی ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

.... تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا - (الفتح: ۲۹)

(اے دیکھنے والے) تو اُن کو دیکھتا ہے کہ (خدا کے آگے) جھکے ہوئے سر بسجود ہیں اور خدا کا فضل اور اس کی خوشنودی طلب کر رہے ہیں -

توحید کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے کائنات، معاشرہ اور اس کی آرزوؤں اور تمناؤں میں جو ایک طرح کی دوئی، اجنبیت، یا غیریت ہے - وہ دُور ہو جاتی ہے اور انسان اپنے گرد و پیش، اور حالات و ظروف کو اپنا مخالف سمجھنے کے بجائے اپنا دوست سمجھنے لگتا ہے - قصہ یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تاحدِ نظر پھیلا ہوا یہ عالم اور انسان ایک ہی نظامِ ربوبیت کا حصہ ہیں - جس خدا نے اس کائنات کو بنایا ہے - وہی خدا تو ہے جس کے دستِ ہنر پرور نے انسانی فکر و تعقل کی پرورش کی ہے - اس لیے ناممکن ہے کہ ان دونوں میں حقیقی اختلاف رونما ہو - یا دونوں اپنی فطرت وجود کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہوں - ہاں یہ البتہ درست ہے کہ انسان کی خواہشات اور آرزوؤں کا دامن چونکہ وسیع اور بوقلموں ہے - اس لیے قدرتی طور پر وہ ان کی تکمیل کی راہ میں اس کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے - اور کبھی کبھی جب حالات و فضا کو ناسازگار پاتا ہے - تو یوں محسوس کرنے لگتا ہے - جیسے اس کو کائنات کو دو مختلف سکیموں کے ماتحت پیدا کیا گیا ہے اور ان دونوں حقیقتاً کوئی ہم آہنگی یا یکجہتی باقی نہیں جاتی -

کائنات اور آرزوؤں کے اس ظاہری اختلاف ہی میں تو تہذیب و تمدن کے ارتقا کا راز پوشیدہ ہے - اگر بیماری نہ ہو، شر نہ ہو - اور ناسازگاریٔ حالات نہ ہوتی تو انسانی فکر و کاوش کے لیے کوئی محرک بھی نہ ہوتا - پھر نہ علم طب ہوتا، نہ اصلاح و تعمیر کا کوئی نقشہ ہوتا - نہ سائنس معجزات دکھاتی، نہ ٹیکنالوجی ترقی کرتی اور نہ آج کے انسان کو تہذیب و تمدن کی اس درجہ سہولتیں اور آسائشیں حاصل ہوتیں - اس کی ذات اور عالم خارجی میں بظاہر یہ اختلاف ہی ہے جس نے اس کی اس فکری پرواز کو بال و پر بخشے ہیں اور اسے اس لائق ٹھہرایا ہے کہ یہ کائنات میں اپنی جد و جہد اور کاوش سے خیر و برکت کے اسباب کو عام کر سکے -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسان کا اشکال یہ نہیں کہ اس میں اور اس کے گرد و پیش پھیلی ہوئی کائنات میں ایسا تضاد رونما ہے۔ جن پر قابو نہیں پایا جا سکتا، یا حقیقتاً کوئی دوری اور اجنبیت پائی جاتی ہے جو دُور نہیں کی جا سکتی۔ اس کا اشکال یہ ہے کہ جب ماحول کی چیرہ دستیوں کے خلاف جنگ کی طرح ڈالتا ہے۔ جب ناکامیوں سے نبرد آزما ہوتا ہے اور مایوسیوں سے لڑتا ہے تو اپنے کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اس مرحلہ میں توحید اس کا ہاتھ پکڑتی ہے۔ اس کو سہارا دیتی ہے اور اس کے دل میں معیت الٰہی کی قندیلیں فروزاں کرتی ہے۔ زندگی بجائے خود تکلیف دہ نہیں۔ اور نہ یہ کائنات اپنی حقیقت و اصل کے اعتبار سے معاندانہ خو بُو اور روش ہی رکھتی ہے۔ مصیبت کا اصل باعث زندگی کے بارہ میں غلط اور مایوس کُن نقطۂ نظر ہے اور اگر اس نقطۂ نظر کو بدل دیا جائے۔ اور قنوط و یاس کی راہ سے ہٹ کر امید و رجا کے بل پر آگے بڑھنے کی کوشش کی جائے تو انسان کی آدھی مشکلات ختم ہو جاتی ہیں۔ نظریۂ توحید سب سے پہلے تو کائنات کے بارہ میں اس غلط فہمی کو دُور کرتا ہے اور اس حُسن ظن کو بیدار کرتا ہے کہ یہ کائنات نہ صرف یہ کہ معاندانہ انداز و اسلوب سے تہی ہے بلکہ اس کے وجود کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ تم اس سے تعاون کرو، اس پر قابو پاؤ، اس سے فائدہ اٹھاؤ۔

وسخر لکم ما فی السمٰوات و ما فی الارض جمیعًا۔ (الجاثیہ: ۱۳)

اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنے (حکم) سے تمھارے کام میں لگا دیا۔

وسخر لکم اللیل والنھار والشمس والقمر۔ (النحل: ۱۲)

اور اسی نے تمھارے لیے رات اور دن، اور سورج اور چاند کو کام میں لگایا۔

جب ایمان کی سطح پر انسان کے دل میں کائنات کے بارہ میں یہ حُسنِ ظن پیدا ہو جائے تو پھر توحید اس سے آگے بڑھ کر، یہ یقین بھی دلاتی ہے کہ تمھاری جد و جہد میں خدا برابر تمھارے ساتھ ہے۔ تم اگر وسائل و ذرائع اختیار کرنے کے سلسلہ میں صحیح راہ پر گامزن ہو تو کامیابی قطعی تمھارے قدم چومے گی۔

انّ اللہ لا یضیع اجر المحسنین ۰ (توبہ: ۱۲۰)

کچھ شک نہیں کہ خدا نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انه من یتق ویصبر فان اللہ لا	جو شخص خدا سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو خدا نیکوکاروں
یضیع اجر المحسنین ○ (یوسف: ۹۰)	کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

اس دنیا کی کامرانیاں جہاں اسباب و وسائل کی رہینِ منت ہیں۔ وہاں یہ بھی واقعہ ہے کہ بسا اوقات یا تو صحیح اسباب و وسائل کی تشخیص ہی نہیں ہو پاتی۔ اور اگر وسائل کی تشخیص کا مرحلہ طے بھی ہو جائے تو پھر ان اسباب و وسائل تک رسائی کا مرحلہ ایک دشوار گزار وادی کے روپ میں آکھڑا ہوتا ہے اور اس کو بھی عبور کر لیجیے تو کچھ اور مخفی رو کاوٹیں اس طرح اُبھر کر اس طرح راستہ روک لیتی ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ کیونکہ عین اس وقت مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب کامیابی بظاہر یقینی ہوتی ہے۔ یعنی امید اور آس کی کمند ٹھیک اس وقت ٹوٹ جاتی ہے جب اس میں اور لبِ بام میں وہی چار ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ توحید کا عقیدہ ایسی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہمیں توکّل کا سبق دیتا ہے۔ توکّل کے معنیٰ ترک اسباب کے نہیں۔ جیسا کہ عام لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس میں کامیابی کے جملہ امکانات پر ایک نظر ڈال لی جائے، اور حسبِ استطاعت ان امکانات و وسائل سے تعرض بھی کیا جائے تاکہ اس راہ کی دشواریوں کا سدِّباب کیا جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یقین و اذعان کی اس کیفیت کی بھی دل میں پرورش بھی کی جائے کہ کامیابی کی اصل کلید اسباب نہیں مسبب الاسباب ہے۔ چنانچہ اگر کام صحیح ہے درست ہے اور مقصد نیک ہے تو اللہ اسباب کی فراہمی میں میرے ساتھ ہے۔ میرے ارادوں اور منصوبوں میں اس کی کارسازی اور توفیق برابر شاملِ حال ہے۔

ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ ط	اور جو خدا پر بھروسہ رکھے گا تو وہ اس کو کفایت
(الطلاق: ۳)	کرے گا۔

اس توفیق و عنایتِ الٰہی کی خاص صورت کو منطق کے مقدمات کی شکل میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا تعلق سراسر تجربہ سے ہے، اس رابطہ سے ہے جو عبد و معبود کے مابین استوار ہے۔ اور یقین و اذعان کے اس درجہ سے ہے جو اسباب و ذرائع سے انسان کو پھیر کر اس خدائے قدوس کی چوکھٹ پر لا گراتا ہے جس نے اس وقت اس کی مدد کی جب اس میں اسباب و ذرائع کا شعور بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور اس وقت اس کی تربیت اور پرورش کا اہتمام کیا۔ جب یہ ایک مضغہ گوشت سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔

یاد رہے کہ توکّل کے دو مقام ہیں۔ ایک مقام تو عوام کا ہے اور ایک خواص کا۔ عوام کے لیے یہی ضروری ہے کہ اسباب و ذرائع کو کبھی بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ اگر بیمار ہوں تو طبیب کی طرف رجوع کریں۔ بیکار ہوں تو کاروبار کی بوقلموں صورتوں پر غور کریں اور مناسب تدابیر اختیار کرنے سے گریز نہ کریں۔ یعنی آنحضرت صلعم کے ارشاد کے مطابق۔ پہلے زانوئے اشتر بند پر عمل کریں۔ اور اس کے بعد معاملہ اللہ کی کارسازی پر چھوڑ دیں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ان لوگوں کی ہر طرح مدد کرے گا۔ ہم جب توکل کی اس نوعیت کو عوام کا توکل کہتے ہیں تو اس سے مراد اس گروہ کی توہین یا استخفاف نہیں، بلکہ محض اس فرق کو بیان کرنا ہے جو توکل کی دو صورتوں میں پایا جاتا ہے۔ ورنہ عام کاروبار حیات چلانے کے لیے اور تہذیب و تمدن کے تقاضوں کو آگے بڑھانے کے نقطۂ نظر سے اس مقام کا ہونا بجائے خود بہت ضروری ہے۔

توکل کی دوسری صورت خواص سے متعلق ہے۔ خواص سے مقصود ایسے بلند حوصلہ افراد ہیں جو اپنی محدود خواہشات اور آرزوؤں سے دست بردار ہو چکے ہیں اور اپنے سامنے رضائے الٰہی کے سوا اور کوئی تمنا نہیں رکھتے۔ جو اللہ کی خوشنودی کے لیے زندہ ہیں اور اسی پر خوش ہیں۔ ان کا توکّل یہ ہے کہ اپنی تمامتر توانائیوں اور کوششوں کو اس آرزو کی تکمیل میں کھپا دیتے ہیں کہ کس طرح۔ اللہ تعالیٰ سے ملنے کی سعادت نصیب ہو۔ کسی طرح وہ راضی ہو، کسی ڈھنگ سے وہ اپنائے، اور کسی جتن سے وہ اپنے غلاموں اور حلقہ بگوشوں میں شامل کر لے۔ یہ لوگ اپنی ضروریات کا سارا بار اس محبوب حقیقی کی عنایات بے پایاں کے کندھوں پر ڈال دیتے ہیں جس کے ساتھ انھوں نے وفا و محبّت کا عہد و پیمان کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ ازراہِ کرم اس توکّل کے صدقے ان کی ضروریات کا خود کفیل اور ضامن ہو جاتا ہے۔

الیس اللہ بکاف عبدہ ۔ کیا خدا اپنے بندوں کو کافی نہیں۔

(زمر: ۳۶)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

توحید کا جان آفرین عقیدہ دل میں، استغنا، خودداری اور جملہ خطرات کے مقابلہ میں بے خوفی و بے نیازی کے جذبہ کی داغ بیل بھی ڈالتا ہے، اور انسان کے باطن میں، یقین کا ایسا دبستان سجا دیتا ہے جس کی شمیم آرائیوں سے کردار و سیرت کے گوشے مہک اٹھتے ہیں۔ جب ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے گا کہ میں جب بھی اس کے باب اجابت پر دستک دوں گا، وہ اس کو سنے گا اور اس کی دعاؤں کو پذیرائی بخشے گا۔ تو ظاہر ہے کہ اس کو اطمینان حاصل ہوگا۔ اس میں اعتماد و حوصلہ پیدا ہوگا اور یہ اس لائق ٹھہرے گا کہ کشاکش حیات کا دلجمعی سے مقابلہ کر سکے گا۔ یہی نہیں یہ ذاتِ گرامی جب پکار پکار کر دعوت دے گی کہ مانگو اور طلب و آرزو کا دامن پھیلاؤ، تو کون ایسا محروم اور بدقسمت ہوگا۔ جو اس کے ساتھ دوستی اور عبودیت کا رشتہ جوڑنے کی کوشش نہ کرے۔

وقال ربکم ادعونی استجب لکم
(المؤمن: ٦٠)

اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری (دعا) قبول کروں گا۔

واذا سألک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان
(بقرۃ: ١٨٦)

اور (اے پیغمبر) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو (تمہارے) پاس ہوں، جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی یکتائی اور تقاضائے توحید کے جہاں یہ معنی ہیں کہ کوئی بھی اس کی صفات میں اس کا شریک اور ساجھی نہیں، وہاں یہ بھی ہیں کہ بخشش و رحمت اور مدد و دستگیری کے معاملہ میں بھی، اس کی کوئی نظیر پائی نہیں جاتی۔ غور کیجیے بھلا اس کے سوا اور کون ہے، جو انسان کے گوشت پوست اور روح و جان سے بھی زیادہ قریب تر ہونے کا دعویٰ کرے۔

نحن اقرب الیہ من حبل الورید۔

اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

(ق: ١٦)

ان اہم فوائد کے علاوہ توحید کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسانی فکر و تدبر خالصتاً، سائنسی اور علمی اسلوب اختیار کر لیتا ہے۔ اور ذہن، توہمات اور بت پرستی کے تمام پردوں کو چاک کر کے اس روشنی کو پا لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ یہ کائنات، نظم و قاعدہ کے سانچوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ڈھلی ہوئی ہے - اس میں علل و اسباب کی ہم آہنگی اور استواری ہے - اس میں ایک ہی قانون کا چلن ہے اور ایک ہی فطرت کی کارفرمائی جلوہ گر ہے - کیونکہ اگر یہاں دو خدا ہیں دو قانون ہوں، اور تخلیق و آفرینش کے اختیارات - دو یا اس سے زیادہ طاقتوں میں انقسام پذیر ہوں تو یہ کارخانہ کشت سے برباد ہو کر رہ جائے -

لو کان فیھما اٰلھۃ الا اللہ لفسدتا - اگر آسمان اور زمین میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے - (الانبیاء : ۲۲)

کائنات کی وسعتوں اور بوقلمونیوں کے باوجود اس میں قانون کی یک رنگی، استواری اور نتائج و اسباب میں نپے تلے ایک ہی نہج کی نشاندہی - ایسی چیزیں ہیں جن سے ان تمام غیر سائنسی افکار و توہمات کا خاتمہ ہو جاتا ہے - جن کو شرک نے پیدا کر رکھا تھا - اور ہمیں کہنے کی اجازت دیجیے کہ کائنات کے بارہ میں یہی وہ صاف ستھرا عقیدہ تھا جس نے ماضی میں مسلمانوں میں علم و تحقیق کے دریچوں کو وا کیا - جس نے سائنسی رجحانات کی پرورش کی - اور مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ یونان کے خزائن فکری سے استفادہ کریں - ہم مستشرقین کے اس نقطۂ نظر سے متفق نہیں ہیں کہ مسلمانوں میں علوم و فنون کے لیے تشنگی کا احساس خارجی اسباب سے ابھرا - یعنی انھوں نے محض اس وقت فلسفہ اور منطق کی طرف اپنی رغبت و میلان کا اظہار کیا - جب ان کو مختلف اقوام کے ساتھ بحث و مناظرہ کے درمیان اس کی ضرورت محسوس ہوئی - اور انھوں نے جان لیا کہ یونانی علوم سے آراستہ ہوئے بغیر اسلامی تہذیب کی برتری ثابت کرنا دشوار ہے - ہم اس حقیقت کو مانتے ہیں کہ مسلمانوں نے جب دوسرے فکری دھاروں کا سامنا کیا - تو انھیں بحث و مناظرہ کی مصلحتوں کے پیش نظر اس دور کی تابش و ضیا سے قلب و ذہن کو منور کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی - مگر صرف اتنی سی بات سے مسلمانوں کے اس عظیم ترجذبہ تحقیق و تفحص کی توجیہ نہیں ہو پاتی کہ جس کے پیش نظر یہ جملہ علوم و فنون کی طرف دیوانہ وار بڑھنے پر مجبور ہوئے کہ زمین کا کونہ کونہ چھانیں علم النجوم کے رازوں کو دریافت کریں - طبیعات میں نئے نئے تجربے کریں - طب، فلسفہ اور منطق کے سرچشموں سے پیاس بجھائیں اور اس جہادِ علمی میں اپنی ہمعصر قوموں سے فخر و پندار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے علم چھین لیں ۔ اس جذبہ طلب و جستجو کے پیچھے جو اسباب کارفرما تھے وہ سراسر داخلی تھے۔ یہ قرآن کی اس تعلیم کا فیض تھا کہ جس نے مسلمانوں کو کائنات میں غور و فکر کی دعوت دی ۔ جس نے مشرکانہ توہمات پر ضرب کاری لگائی ۔ اور توحید کے ذریعہ اس یقین کو بیدار کیا کہ اس کارگاہِ حیات میں نتیجہ و سبب میں جو لزوم پایا جاتا ہے اور اسباب کی کڑیاں جس طرح مسببات سے وابستہ ہیں ۔ ان میں صرف ایک ہی قانون اور قاعدہ کا چلن ہے ۔ اس میں دو رنگی پائی نہیں جاتی ۔ کیونکہ اگر اس کائنات کا پروردگار ایک اور یقیناً ایک ہے تو منطقی طور پر اس میں دو اراد ے، دو قانون اور فرماں روائی کے دو الگ الگ اسلوب پائے نہیں جا سکتے۔

سیّد امیر علی

شاہد حسین رزاقی

سیّد امیر علی اپنے عہد کی ایک عظیم شخصیت تھے ۔ اسلامی ہند کی نشاۃ ثانیہ کے کارفرماؤں میں ان کا بلند مقام ہے ۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے ۔ وہ سیاست دان بھی تھے، ایک روشن خیال مفکر بھی اور مصنف کی حیثیت سے تو ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا ۔ قانون اسلامی میں ان کی نظر بڑی گہری تھی ۔ مسلمانان پاک و ہند کے قومی حقوق کے لیے گزشتہ صدی کے اواخر میں جب آئینی جدوجہد شروع ہوئی تو اس میں وہ پیش پیش تھے ۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں ۔ مسلمان ملکوں کے دفاع اور خلافتِ عثمانیہ کو مغربی یلغار سے بچانے میں بھی آپ برابر کوشاں رہے ۔

اس کتاب میں سیّد امیر علی کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں کو شرح و بسط سے پیش کیا گیا ہے ۔

صفحات : ۳۰۹ — قیمت : ۸ روپے

ملنے کا پتہ : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور

© rasailojaraid.com